(3) میرزا خان داغ

(۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء)

تعارف: نواب مرزا خان نام اور داغ تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام شمس الدین خاں تھا۔ جن کو ۱۸۳۵ء میں پھانسی ہوگئی۔ داغ کی ماں نے مرزا محمد سلطان (بہادر شاہ ظفر کے بیٹے) سے شادی کرلی اور یوں داغ لال قلعہ میں پرورش پانے لگے۔

مرزا داغ دہلوی ذوق کے شاگرد ہوئے۔ شاعری کی زبان صاف شوخ اور چلبلے پن کے ساتھ ساتھ محاورہ بندی سے بھی مزین ہے۔ عشق و عاشقی ان کے لیے ایک سنجیدہ طرز نہیں بلکہ کھل کھیلنے اور چسکے کی چیز ہے۔ انھیں نہ احترامِ عشق ہے اور نہ پاسِ ناموسِ محبوب۔ بس اپنا مطلب نکالنے سے غرض ہے۔

داغ نے محبوب سے محبت، لگاوٹ اور شکوہ شکایت اور طعن و تشنیع کی ایسی باتیں کیں کہ سودا کی نخوت، میر کی دردمندی اور غالب کی وجاہت کا دم ٹوٹ گیا اور غزل لمحہ حاضر کے نشاط کی آئینہ دار بن گئی۔

چار دیوان چھپے ہیں، جن کے نام گل زارِ داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور یادگارِ داغ کے علاوہ ایک عشقیہ مثنوی ''فریادِ داغ'' بھی قابلِ ذکر ہے۔

اک حرفِ آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے
اتنی سی بات کہہ کے گناہ گار ہو گیا

غزل 1

شعر 1 پھرے راہ سے وہ، یہاں آتے آتے — اجل مر رہی تو، کہاں آتے آتے

(ملتان 2010ء لاہور 2008ء، سرگودھا بورڈ 2012ء)

حل لغت: پھرے: واپس چلے گئے — اجل: موت

مفہوم: محبوب میرے پاس آتے ہوئے راستے ہی سے لوٹ گیا۔ اے موت اگر محبوب نے نہیں آنا تھا تو ہی چلی آتی۔

تشریح:

آسمان سخن کا ایک ایسا چمک دار ستارا جس سے روشنی تو بہت سوں نے پائی مگر شاعری کے لیے اقبال بن کر ابھرنے والا اقبال بھی اسی ستارے سے روشنی پاتا دکھائی دیتا ہے۔ اُردو زبان سے بے مثال محبت کرنے والا یہ شاعر جسے اہل سخن داغ دہلوی کے نام سے جانتے ہیں۔

انھوں نے اپنی غزل کے تشریح طلب شعر میں محبوب کی غفلت اور عدم توجہی کا مضمون باندھا ہے۔ راہِ عشق میں عاشق کو بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ اِن تمام مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے تاکہ اُس کا محبوب اُسے حاصل ہوجائے۔ تاہم محبوب عاشق کے مصائب سے یکسر بے نیاز واقع ہوتا ہے۔ عاشق محبوب کے فراق میں سخت عذاب میں ہوتا ہے اس کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ اسے محبوب کے چہرے کی ایک جھلک ہی دکھائی دے تاکہ وہ آنکھوں کی پیاس بجھا سکے لیکن عاشق دیدارِ محبوب کے لیے تڑپتا رہتا ہے اور عاشق کے دیدار کی خواہش کبھی پوری نہیں ہو پاتی۔ اس مقصد کے لیے وہ محبوب کی خاطر تمام مصائب اور رسوائیاں برداشت کرتا ہے تاکہ محبوب کے روبرو سرخرو ہوسکے لیکن محبوب کبھی اپنے عاشق پر نظرِ کرم نہیں کرتا۔ بقول جاوید انجم لائل پوری:

محبت مضطرب ہے بہر درشن
مگر کچھ حسن کو پروا نہیں ہے

عاشق کی خدمات کے گراں بوجھ کو محسوس کرتے ہوئے محبوب اُس سے ملنے کا وعدہ تو کر لیتا ہے۔ لیکن یہ وعدہ کبھی وفا نہیں ہوتا۔ عاشق اس عہد و پیمان سے مطمئن ہو جاتا ہے اور ایک ایک گھڑی گن کر محبوب کے انتظار میں گزار دیتا ہے۔ لیکن محبوب نہیں آتا اور عاشق کی حالت غیر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ عاشق تمام شب محبوب کا منتظر رہتا ہے لیکن محبوب کو ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا۔ انتظار کی اسی کیفیت کو فیض احمد فیض یوں بیان کرتے ہیں:

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

شاعر کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔ محبوب نے شاعر کے پاس آنے کا وعدہ کیا جسے شاعر سچ سمجھ بیٹھا اور محبوب کا انتظار شروع کر دیا۔ اُدھر محبوب تھا کہ وعدہ کر کے گویا یکسر بھلا دیا۔ اُس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ کوئی مصیبت کا مارا ہوا عاشق اُس کا منتظر ہے۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو اکثر ہوتا آیا ہے۔ شاعر بے قراری سے اُس کا انتظار کرتا رہا لیکن محبوب نہ آیا۔ اور انتظار کی حالت تو موت سے بھی کڑی ہوتی ہے۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ عاشق کے لیے روح فرسا ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک شاعر نے کہا ہے

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

شاعر کو بعد میں معلوم ہوا کہ محبوب گھر سے عاشق کے پاس آنے کا ارادہ کر کے نکل پڑا تھا اور کچھ راستہ بھی طے کیا مگر راستے میں سے لوٹ گیا۔

اب شاعر یہ سن کر بہت پریشان ہوتا ہے کہ پتا نہیں محبوب کیوں لوٹ گیا۔ کہیں رقیب نے تو اُسے بدظن نہیں کر دیا۔ یا پھر ایک لمحے کے لیے مہربان ہو کر پھر جفا کاری پر اُتر آیا ہے۔ کیوں کہ محبوب فیصلے بدلتا رہتا ہے۔ بقول پروین شاکر:

تمام رات میرے گھر کا ایک در کھلا رہا
میں راہ دیکھتی رہی وہ راستہ بدل گیا

بہر صورت وجہ کچھ بھی ہو شاعر محبوب کے واپس چلے جانے کا سُن کر شدید پریشان ہوا اور صدمے کی وجہ سے قریب المرگ ہو گیا۔ لیکن موت نہ آئی۔ شاعر غصے سے موت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے موت تو کہاں چلی گئی؟ تو کیوں نہ آئی؟ محبوب اگر نہیں آیا تو تُو ہی آ جاتی، تا کہ محبوب کے انتظار کی جان کنی کی گھڑیوں سے نجات مل سکتی۔ زندگی اور وہ بھی انتظار کے ساتھ دوہری مصیبت ہے۔ نہ تو محبوب آیا کہ انتظار ختم ہوتا، نہ موت آئی کہ زندگی کی ڈور منقطع ہو جاتی، گویا ستم بالائے ستم محبوب آتا تو انتظار ختم ہو جاتا اور شاعر کی زندگی بھی آسان ہو جاتی۔ لیکن محبوب نہ آیا تو شاعر نے موت کی تمنا کی کہ چلو موت کے آنے سے انتظار کی اذیت سے تو نجات مل جاتی۔

شعر 2

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

(ملتان 2010، لاہور 2008، فیصل آباد 2006، سرگودھا بورڈ 2012، بہاول پور 2012)

حل لغت: نہ جانا: احساس نہ کرنا
دنیا سے جانا: مر جانا

مفہوم: اے محبوب! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ اس بات کا احساس نہ کیا کہ کوئی تمھیں دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر نے پھر محبوب کی عدم توجہی اور لاپروائی کا مضمون باندھا ہے۔ محبوب عاشق کے کرب و ابتلا سے یکسر بے نیاز رہتا ہے۔ عاشق اُس کے سامنے منت سماجت کرتا ہے اور اس سے شرف ملاقات کا طالب ہوتا ہے۔ محبوب اُس

ے وعدہ بھی کر لیتا ہے لیکن یہ وعدہ وفا نہیں ہوتا۔ عاشق تمام عمر محبوب کا منتظر ہی رہتا ہے۔ لیکن محبوب کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وصل اور دیدار کی خواہش آہستہ آہستہ حسرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عاشق کی ساری عمر گزر جاتی ہے اور وہ قریب المرگ ہو جاتا ہے، لیکن عاشق اس حال میں بھی محبوب کا متمنی رہتا ہے۔ لیکن محبوب اُس کے پاس نہیں پھٹکتا۔ محبوب کو احساس بہت دیر سے ہوتا ہے۔ محبوب کو اُس وقت عاشق کا احساس ہوتا ہے، جب عاشق موت کے منہ میں جا رہا ہوتا ہے، گو کہ عاشق ایک مدت سے بستر مرگ پر پڑا محبوب کا منتظر ہوتا ہے۔ لیکن محبوب ہے کہ کسی طرح عاشق کو اپنا دیدار نہیں کراتا اور عاشق محبوب سے ملنے کی تمنا دل ہی میں لیے اس دنیا کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ ایک اور شاعر اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔ بقول میر تقی میر:

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم　　　　تو اب اس عہد کو وفا کر چلے

عاشق کے ساتھ بھی اسی طرح کا سانحہ ہوا ہے۔ محبوب نے بالکل اس کا لحاظ نہیں کیا کہ اُس کے فراق کے صدمے اٹھا کر کوئی موت کی آغوش میں جا رہا ہے۔ ایک مرتے ہوئے شخص کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنی عزیز ترین شے کو آنکھوں کے سامنے دیکھے۔ لیکن اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہوتی۔ پس شاعر کا دم بھی حالتِ بے سکونی میں نکلتا ہے۔ بقول یعقوب انجم:

میرے مرنے کے بعد آؤ گے　　　　کیا زمانے کو منہ دکھاؤ گے

جب عاشق دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو محبوب کو لوگوں کے طعنے اور دنیا کے رسوم و رواج کے بموجب عاشق کی موت پر افسوس کے لیے جانا پڑتا ہے۔ اسی موضوع پر اردو کے بیشتر شاعروں نے قلم کشائی کی ہے۔

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب　　　　تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

تاہم عاشق کہتا ہے کہ اب آنا بے سود ہے۔ عاشق طنزاً محبوب کو مہربان کہتا ہے کہ اے جفا کار مہرباں تو نے آنے میں بہت دیر کر دی اب آنا لاحاصل ہے۔ اب وقت گزر چکا ہے۔ تیری راہ دیکھنے والی آنکھیں پتھرا چکی ہیں۔ تیرے ستم کے نشتر سہنے والا اب تڑپ تڑپ کر جان دے چکا ہے۔ تیری نظروں کے گھائل کو آج موت نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا۔

سچے عشق میں ایسی کشش ہے کہ جو بالآخر محبوب کو عاشق کے پاس کھینچ ہی لاتی ہے خواہ اس وقت تک عاشق خاک میں مل چکا ہو۔ خسرو کے ایک فارسی شعر کا مفہوم ہے کہ:

"اے محبوب، عشق کی کشش تجھے اسی طرح (بے نیاز) نہیں رہنے دے گی۔ تو اگر میرے جنازے پر نہیں آیا تو کوئی بات نہیں میری قبر پر تو ضرور آئے گا"

شعر 3　　سُنانے کے قابل جو تھی بات اُن کو　　　　وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

(لاہور 2008، سرگودھا بورڈ 2012، بہاول پور 2012)

مفہوم: وقت ملاقات محبوب سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں لیکن اصل بات میں سنا ہی نہ سکا۔

تشریح:

ایک عاشق کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبوب سے ہم کلام ہو اور اُسے اپنے مصائب و تکالیف سے آگاہ کرے۔ اس طرح دوہرا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ایک تو خود اس کا غم بٹ جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ اُس کے مصائب کے متعلق سن کر محبوب کا دل پسیج سکتا ہے۔ محبوب سے ملاقات سے قبل عاشق تمام باتیں سوچتا ہے اور عزم صمیم کرتا ہے کہ وہ ان کو آج محبوب کے روبرو بیان کر دے گا۔ مگر جب محبوب سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ خاص بات بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ شاعر نے ایسے ہی عاشق کی ترجمانی کی ہے۔

سب کہنے کی باتیں ہیں، یوں کہتے جو وہ آتا　　　　کہتے تو ہو یوں کہتے، کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس خاص بات سے پہلو تہی کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ کیوں کہ محبوب سے ملاقات کا شرف حاصل ہونا بذاتِ خود ایک مشکل اور معجزاتی عمل ہے۔ تاہم اگر کبھی ملاقات ہو بھی جائے تو محبوب کے چہرے کو دیکھ کر اُس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ اُس کے حسن و رعنائی کو دیکھ کر اُس کے حواس جاتے رہتے ہیں اور اُس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ بس وہ خاموش کھڑا اُسے تکتا رہتا ہے اور سوچی ہوئی باتوں میں سے کچھ بھی نہیں کہہ پاتا۔ بقول شاعر:

وہ سامنے جب آجاتے ہیں یک لخت یہ کیا ہو جاتا ہے　　میں دل سے جدا ہو جاتا ہوں دل مجھ سے جدا ہو جاتا ہے

محبوب کو دل کی بات نہ کہہ سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب محبوب گفتگو شروع کرتا ہے تو عاشق اس کی گفتگو میں کھو جاتا ہے۔ اُسے محبوب کی گفتگو اتنی شیریں، روح افزا اور وجہِ عافیتِ جسم و جاں معلوم ہوتی ہے کہ وہ محبوب ہی کی بات سنتا رہتا ہے اور اپنی بات نہیں کہہ پاتا۔ بقول شاعر:

میں آج بھی نہ تم سے کوئی بات کر سکا　　لفظوں کے پتھروں میں تمنا دبی رہی

محبوب کے سامنے اپنی دلی بات بیان نہ کرنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر عاشق نے اُس کے سامنے اُس کی جفا کاری کی بات کی اُس کی غفلت، لاپروائی، بے مروتی، ظلم و ستم، بے وفائی و بے نیازی کی بات کی، تو ہو سکتا ہے کہ محبوب برگشتہ ہو جائے اور کبھی کبھار کی ملاقات کے جو لمحے میسر آجاتے ہیں شاید پھر ان کی بھی نوبت نہ آئے۔ عین ممکن ہے کہ محبوب ناراض ہو کر بگڑ جائے اور اُس کا بگڑنا عاشق کے لیے موت سے کم تکلیف دہ نہ ہوگا۔ لہٰذا عاشق اس ظالم کے سامنے چپ سادھ لیتا ہے۔

اور بقول ساغر صدیقی محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ:

ہائے آدابِ محبت کے تقاضے ساغرؔ　　لب کھلے اور شکایات نے دم توڑ دیا

محبوب کے سامنے دلی بات اور اُس کے ستم کا نہ کہنے کی ایک علت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کہیں محبوب زمانے میں ظالم اور جابر نہ مشہور ہو جائے۔

شعر 4　　مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے　　چمن اُڑ گیا، آندھیاں آتے آتے

(ملتان 2010، فیصل آباد 2006، بہاول پور 2012ء)

حلِ لغت:　　آشیاں: گھونسلہ، گھر　　چمن: باغ، گلستان

مفہوم:　　آندھیوں کی اتنی شدت تھی کہ تمام چمن ویران ہو گیا، میرا آشیاں تو معمولی تھا۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر نے استعارے کے پردے میں ''چمن'' اپنے ملک یعنی برصغیر کو قرار دیا ہے۔ اور آندھیوں سے مراد برصغیر پر ہونے والے حملے اور اس کے داخلی، خارجی و سیاسی حالات ہیں۔ شاعر کہتا ہے غیر اقوام کے تند و تیز حملوں میں اس قدر شدت تھی کہ سارا برصغیر ویران ہو گیا۔ میرے گھر کی تباہی اس سانحے کے سامنے چنداں وقعت نہیں رکھتی۔ گویا شاعر سارے برصغیر کا مرثیہ خواں ہے۔ بقول اقبالؔ:

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا　　وہ گُل ہوں میں، خزاں ہر گُل کی ہے گویا خزاں میری

اس بربادی کے پیچھے طویل داستان کارفرما ہے۔ اپنی زندگی میں تو اورنگزیب عالمگیر نے مرہٹہ فتنہ دبائے رکھا تاہم 1707ء میں اس کی وفات کے بعد ''پونا'' سے مرہٹہ فتنہ ابھرا اور برصغیر کی ویرانی شروع ہوئی۔ پھر 1739ء میں نادر شاہ نے فتح دہلی کے بعد قتلِ عام کا حکم دیا اور خون کی ندیاں بہا دیں، احمد شاہ ابدالی نے سلطنتِ مغلیہ کی بنیادیں مزید کھوکھلی کر دیں۔ اس طرح

بار بار کے حملوں سے برصغیر میں طوائف الملوکی پھیلتی چلی گئی اور برصغیر جو کبھی ایشیا کا خوش حال ترین اور پر امن ملک ہوتا تھا۔ مگر بدامنی اور بدحالی اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

آندھیوں نے اجاڑ ڈالے ہیں   پیڑ جتنے بھی تھے ثمر والے

لیکن برصغیر کی بربادی کا مرکزی کردار انگریز تھا۔ یہ وہ قوم تھی کہ جس پر اقبال کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ "چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر"۔ جنگ آزادی جسے انگریز ہمیشہ "غدر" کہتے تھے، میں غداروں کی وجہ سے ہندوستانیوں کو شکست ہوئی تو مسلمانوں کا وہ استحصال شروع ہوا کہ تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سفید فاموں نے وہ خونچکاں باب رقم کیے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے خود انگریز بھی بعض اوقات نادم ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، مذہبی، سائنسی، ثقافتی، علمی اور ادبی لحاظ سے مفلوج کرنے کی کوشش کی گئی۔

مرزا خان داغ کے والد نواب شمس الدین کو ایک انگریز ولیم فریزر کو قتل کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ اس وقت مرزا کی عمر چھ سال تھی۔ ان کے والد کی وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر کے بیٹے شہزادہ فتح الملک مرزا نے داغ کی والدہ چھوٹی بیگم کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ چناں چہ مرزا بھی شاہی قلعہ میں رہنے لگے اور وہیں ان کی تربیت ہوئی اور 1857ء کے بعد آنے والا طوفان ہی تو جس نے لال قلعے کو برباد کیا۔ لال قلعہ نشان عبرت بنا دیا گیا۔ مغل شہزادے نیزے میں پرو دیے گئے۔ نومولود بچوں پر تیغ زنی ہوئی۔ قلعے کے صدر دروازے کے باہر مغل شہزادوں کی لاشیں چیخ چیخ کر یہ کہہ رہی تھیں۔ بقول میر تقی میر:

اب خرابہ ہوا جہاں آباد   ورنہ اک اک قدم پہ یاں گھر تھا

آزادی پسند مسلمانوں کو تیل کے کڑاہے میں ابال دیا گیا۔ قرآنی نسخے جلائے گئے اور علما کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ غداروں کے لاوے نے پورا برصغیر ویران کر دیا۔ اسی ضمن میں شاعر کہتا ہے کہ برصغیر کے تمام لوگوں پر ہی غم و الم کے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ تمام لوگوں ہی کے شاد آباد گھرانے ویران ہوئے ہیں۔ ایسے میں میرے گھر کے اجڑنے کا چنداں دکھ نہیں کیوں کہ ان گنت انسانوں کی بربادی کے سامنے ایک انسان کی بربادی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ بقول شاعر:

ہو گلہ اپنی تباہی کا بھلا کیوں انجم   جانے کتنوں کے غدر نے اجاڑے ہیں گلشن

شعر 5   نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو   کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

مفہوم:

اے داغ دوستوں سے کہہ دو کہ اردو زبان آسان نہیں ہے۔ یہ آہستہ آہستہ ہی آتی ہے۔

تشریح:

اردو زیادہ قدیم زبان نہیں پھر بھی اس زبان کا آغاز مسلمانوں کی برصغیر میں آمد سے ہوا۔ لیکن اس زبان نے زیادہ ترقی طوائف الملوکی کے دور میں کی۔ اردو کے معنی لشکر کے ہیں کیونکہ یہ زبان کئی زبانوں کا حسین امتزاج اور مرقع ہے۔ سب سے پہلے 712ء میں محمد بن قاسم کی قیادت میں یہاں خالصتاً عربوں نے حملہ کیا۔ اور بڑے پیمانے پر یہ پہلا مسلم حملہ تھا۔ یہاں کے باسی ہندی زبان بولتے تھے۔ بعض عربوں نے یہاں رہائش اختیار کی۔

سلطان محمود غزنوی نے ہند پر حملہ کیا اور پٹھانوں کے جوق کے جوق یہاں آئے۔ شمال سے چنگیز خان کی قیادت میں گو منگول اٹھتا ہے تو خوارزم، بخارا، سمرقند کی تاراجی کے بعد یہاں کے کچھ خاندان برصغیر آئے۔ مغلوں کے ہاتھوں ایران کی تسخیر کے بعد یہاں فارسی بولنے والے آ گئے۔ شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر ترکوں اور پٹھانوں کا لشکر ہندوستان لایا۔ جس میں بہت بڑی تعداد ترک اور ازبک زبان بولنے والے برلاس، تاتاری، مغل، گورگان، گوری اور گور چان قبائل یہاں آئے۔ ان تمام لوگوں کے

اکٹھے رہنے سے ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ جس میں ان تمام زبانوں کے الفاظ، خصائص، قواعد و قوانین شامل ہو گئے۔ یہ زبان ہندی، عربی، فارسی، ترکی اور ازبک زبان کا امتزاج تھی۔ بقول شاعر:

ربطِ باہم کے لیے اُردو زباں اپنی جگہ
دل کش و شیریں مقامی بولیاں اپنی جگہ

اس وجہ سے اردو خاصی مشکل زبان ہے۔ اردو تو ہماری مادری زبان ہے اس لیے ہمیں یہ مشکل محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کوئی غیر اردو، اردو سیکھے تو یہ بہت مشکل کام ہوگا۔ کیوں کہ اس کی اپنی گرائمر نہیں ہے۔ بلکہ اُردو گرائمر، فارسی، ترکی اور عربی کی گرائمروں سے ماخوذ ہے۔ واحد جمع کا مسئلہ ہو تو عربی سے لیے گئے الفاظ عربی کے مطابق جمع بنائے جائیں گے۔ فارسی کے فارسی گرائمر کے مطابق اور ترکی کے ترکی گرامر کے مطابق، یہی حال تذکیر و تانیث کا ہے۔ چناں چہ اس طرح یہ زبان کافی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ پٹھان لوگ جو اُردو بولتے ہیں اُس میں تذکیر و تانیث کی کافی غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایک اور جگہ داغ کہتے ہیں:

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے
اُردو ہے جس کا نام، ہمیں جانتے ہیں داغ

غزل نمبر 2

شعر 1 جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا

حل لغت: خاطر: لحاظ، پاس ایمان جانا: عقیدے کا ناقص ہونا، عقیدہ درست نہ ہونا، عقیدہ خراب ہونا

مفہوم: اے محبوب! میں نے تیرا لحاظ کرتے ہوئے تمھاری بات مان لی ہے لیکن جھوٹی قسم کھانے کی وجہ سے تمھارا عقیدہ ناقص ہو گیا ہے۔

تشریح:

تشریح طلب شعر معاملہ بندی کا شعر ہے۔ شوخی، زندہ دلی، چلبلہ پن اور شرارت آمیز لہجہ داغ کی معاملہ بندی کے اوصاف ہیں۔ وہ منکسر المزاج عاشق کی طرح ہم کلام نہیں ہوتے بلکہ اُن کا کلام تقریباً جارحانہ ہوتا ہے۔ محبوب کے ساتھ نوک جھونک اُن کے کلام کی خاص خوبی ہے۔ اُن کے ہاں کا عاشق زبان بند اور چپ سادھنے والا نہیں ہوتا بلکہ منہ پھٹ اور شکوہ و شکایت پر اُتر آتا ہے۔ بقول شاعر:

کیوں نہ اس شخص کو محفل سے نکالا جائے
منہ پہ کہتا ہے کھری بات، ہے کتنا بے باک

اُردو کی روایتی شاعری میں تین اہم کردار دکھائی دیتے ہیں، عاشق، محبوب اور رقیب۔ رقیب اور عاشق میں چپقلش جاری رہتی ہے جب کہ اُن دونوں کا مطلوب و مقصود محبوب ہوتا ہے۔ رقیب عاشق کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ جب کہ وہ سچا عاشق نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر وہ محبوب تک رسائی میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ سچے عاشق کو محبوب سے بے پناہ عشق ہوتا ہے وہ اس کی خاطر مصائب برداشت کرتا ہے اور اس کی تمام خواہشات اور تمنائیں پوری کرتا ہے۔ محبوب کے ایک اشارے پر وہ جان جوکھوں میں ڈال دیتا ہے۔ تاہم احسان فراموش محبوب رقیب کے ساتھ میل جول رکھتا ہے۔ اس میل جول کے متعلق اُسے دوسرے لوگ مطلع کرتے ہیں کہ تم محبوب کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہو جب کہ محبوب رقیب کا خیر خواہ ہے۔ یہ بات سُن کر عاشق کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا۔ وہ یہی تصور کرتا ہے کہ یہ بات سچ نہیں ہے۔ تاہم جب عاشق کو اس رابطے کا یقین ہو جاتا ہے، تو وہ محبوب سے اس کی شکایت کرتا ہے کہ تمھیں میرے سوا کسی غیر سے روابط نہیں رکھنے چاہئیں۔ ایک اور شاعر کے بقول:

میرے بھی ساتھ ساتھ تھے، دشمن سے بھی ملے رہے
کتنے عجیب لوگ تھے جن کے یہ مشغلے رہے

تاہم محبوب عاشق کے سامنے صاف انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمھیں لوگوں نے غلط مطلع کیا ہے۔ تمھیں حاسدوں نے بھڑکایا ہے اور یہیں پر بس نہیں بلکہ محبوب اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے قسم تک اٹھالیتا ہے کہ اس نے رقیب کے ساتھ کبھی میل جول رکھا ہی نہیں۔

شاعر نے اسی طرح کے عاشق کی ترجمانی کی ہے جس نے محبوب سے اس طرح کا شکوہ کیا لیکن محبوب نے قسم اٹھالی، تو عاشق کہتا ہے کہ میں نے لحاظ کرتے ہوئے تمھاری بات کا یقین تو کر لیا ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم نے جھوٹ بولا ہے۔ بقول شاعر:

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھایئے قسمیں مجھے یقین ہوا، مجھ کو اعتبار آیا

تاہم شاعر دوسرے مصرعے میں کہتا ہے کہ اے محبوب اگر تو نے جھوٹی قسم کھالی ہے تو اس سے تمھارا عقیدہ ناقص ہو چکا ہے۔ جھوٹی قسم تمھارے دامن پر دھبہ ہے اور بروزِ حشر تم سے اس کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی۔ عاشق نے معاملے کو آخرت پر چھوڑ کر ایک تو اپنے لیے قلبی تسکین فراہم کی ہے اور پھر دوسرا محبوب کو خوفِ حساب سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم پھر بھی وقتی طور پر عاشق نے محبوب کی بات مان لی ہے۔ اگرچہ محبوب جھوٹا ہے۔

حسیں کہہ رہے ہیں خدا کی قسم بتوں کی زباں پہ خدا آگیا

شعر 2 دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

(بہاول پور 2010ء، سرگودھا 2010ء)

مفہوم: محبوب کو میں نے دل دیا لیکن اس مفت شے کے ملنے کا احسان مند ہونے کی بجائے اُلٹا شکوہ شروع کر دیا۔

تشریح:

کلاسیکل غزل کی روایات میں عاشقوں کا ہمیشہ سے یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنی خواہشات پس پشت ڈال کر محبوب کی مدح و تعریف پر کمربستہ رہتے ہیں۔ عاشق اپنی تمام خواہشات پر محبوب کی خواہشات کو مقدم سمجھتا ہے۔ عشق کی بازی لگانے کے بعد اُس کی ذاتی خواہشات دم توڑنے لگتی ہیں اور محبوب کی خواہشات ہی اُس کی خواہشات قرار پاتی ہیں۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عاشق نے اپنا دل محبوب کے حوالے کر دیا جب کہ ہر شخص کی تمام خواہشات اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہیں لیکن عاشق کا دل تو اب محبوب کی خواہشات کے تابع ہو چکا ہے اُس کی اپنی خواہشات مفقود ہو چکی ہیں، اُس کا دل مکمل طور پر محبوب کا مطیع ہو گیا ہے۔ بقول مرزا غالب:

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مفت میں ہتھیائی ہوئی شے کی اول تو کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو اتنی نہیں ہوتی جتنی اُس کی ہونی چاہیے۔

شاعر نے جس عاشق کی ترجمانی کی ہے اُس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اُس نے محبوب کو دل دیا یعنی محبوب کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنی خواہشات کو پسِ پشت ڈال کر، محبوب کے نافذ کردہ احکام کی پیروی کرنا شروع کر دی۔ اُس نے اپنا محبت بھرا اور پر خلوص دل محبوب کے حوالے کر دیا۔ تاکہ محبوب اُس کے خلوص اور جذبۂ محبت کی قدر کرے اور محبوب کو اُس کی وفا شعاری کا یقین آجائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا عاشق نے تو محبت جتلانے کے لیے دل محبوب کے حوالے کیا تھا لیکن یہاں معاملہ ہی برعکس ہو گیا۔ محبوب نے احسان مند ہونے کی بجائے صاف کہہ دیا کہ یہ دل تو کسی کام کا نہیں، یہ دل تو بیکار ہے، رنگینی و دلفریبی سے عاری۔ گویا عاشق کے پُرخلوص دل کی تذلیل کر دی۔ بقول شاعر:

یہ ادائے بے نیازی کہ وہ میرے دل کو لے کر — بڑی بے رُخی سے بولے، کسی کام کا نہیں ہے
دل دیا تھا کہ ہوں وہ شکر گزار — اُس نے الٹا شکایتیں کی ہیں

شعر 3

ڈرتا ہوں دیکھ کر دلِ بے آرزو کو میں — سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو، مہمان تو گیا

(بہاولپور 10-2007، ملتان 09 سرگودھا 2010)

حل لغت: سنسان: ویران

مفہوم: مجھے اپنی خواہشات سے خالی دل کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا ہے کہ مہمان کے رخصت ہونے سے میرے دل کا آشیانہ ویران ہو چکا ہے۔

تشریح:

ایک زندہ انسانی دل خواہشات سے معمور ہوتا ہے۔ زندگی بالواسطہ خواہشات ہی سے عبارت ہے۔ انسانی دل میں ہر وقت کوئی نہ کوئی خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ایک خواہش رخصت ہوتی ہے تو کوئی دوسری خواہش سر اٹھا لیتی ہے۔ انسان کی یہی خواہشات اسے کامیابی سے ہم کنار کر سکتی ہیں اور ناکامی کا منھ بھی دکھا سکتی ہیں۔ انسان کسی بھی خواہش کی تکمیل کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے جدوجہد بھی کرتا ہے۔ گویا انسان کی حرکت خواہشات کے وجود ہی سے قائم ہے۔ بقول اقبال

"حرکت زندگی اور جمود موت ہے"۔

چناں چہ زندگی کی تمام حرکت اور چہل پہل کو خواہشات ہی کی وجہ سے دوام ہے۔ ایسا ہی دل اصل میں زندگی سے لبریز ہے اور زندہ کہلانے کا حق دار ہے۔ بقول شاعر:

مجھے یہ ڈر ہے، دل زندہ تو نہ مرجائے — کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

مثال کے طور پر آج تک جتنی سائنسی ترقی ہوئی ہے وہ بھی خواہشات کی مرہون منت ہے۔ انسان کی یہ خواہش تھی کہ وہ خلا کے متعلق اور کائنات کے متعلق جانے، چناں چہ اس نے کائنات کی وسعتوں کے سینے چیر ڈالے۔ اپنی زندگی کو سہل بنانے کے لیے اس نے کوشش کی تو نئی نئی ایجادات واختراعات نے جنم لیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں دنیا کا وجود ہی خواہشات سے قائم ہے۔ خواہشات کی عدم موجودگی میں جمود طاری ہو جائے تو موت کی مثل ہے۔ لیکن تمام خواہشات کبھی پوری نہیں ہوتیں انسانوں کی اکثر بیت خواہشات پوری نہ ہونے پر افسردہ ہو جاتی ہے۔ بقول میر:

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

لیکن جب ایک انسان کے دل میں مسلسل خواہشات پیدا ہونا بند ہو جائیں تو اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے اور دوسرے الفاظ میں وہ ایک جیتی جاگتی "لاش" ہوتی ہے۔ دراصل جب انسان کی مسلسل کئی خواہشیں یکے بعد دیگرے ناکام ہو جاتی ہیں تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ یہی لمحہ ہے جب مایوسی کی وجہ سے اس کی خواہشات پیدا ہونا بند ہو جاتی ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں — تمنا جو نہ پوری ہو وہ کیوں پلتی ہے سینے میں

تشریح طلب شعر میں شاعر نے ایسے ہی عاشق کی ترجمانی کی ہے کہ جس کے دل میں مزید خواہشات پیدا ہونا ختم ہو گئی ہیں۔ اور وہ دل جو کبھی خواہشات سے بھرپور ہوتا تھا اب خالی ہو چکا ہے۔ شاعر نے خواہشات کو مہمان قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ میرے دل کا مہمان (خواہش) رخصت ہو چکا ہے اور اب مجھے اپنے خواہشات سے خالی دل کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کسی کو ویران گھر میں اکیلے ہونے کی وجہ سے خوف محسوس ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ شاعر نے یہاں مہمان اپنے محبوب کو قرار دیا ہو۔ یعنی عاشق کے دل میں پہلے دیدار و وصل کی تمنا موجود تھی۔ لیکن پے در پے ناکامیوں کے بعد یہ خواہش ختم ہوگئی اور اب عاشق نے محبوب کے ساتھ قطع تعلق کر لیا اور اب اس کا دل خالی ہو چکا ہے کیوں کہ دیدار و وصل کی سب سے بڑی خواہش رخصت ہو چکی ہے۔

شعر 4

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں | لیکن اسے جتا تو دیا، جان تو گیا

(بہاولپور 07، ملتان 09 ڈی جی خاں 06، سرگودھا 10)

حل لغت: افشائے راز: بھید ظاہر ہونا — جتا دینا: احساس دلا دینا

مفہوم: اگرچہ عشق کا بھید ظاہر ہونے سے میری رسوائی ہوئی تاہم میں نے محبوب کو اپنے عشق کا احساس تو دلا دیا۔

تشریح:

عاشقوں کا ہمیشہ یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنے عشق کی وجہ سے محبوب کو رسوا نہیں ہونے دیتے۔ وہ ہر حال میں ایسے افعال سے گریز کرتے ہیں، جس سے محبوب کی رسوائی کا اندیشہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات وہ اپنے عشق کے متعلق بھی محبوب کو آگاہ نہیں کرتے کہ کہیں محبوب کی تشہیر نہ ہو جائے۔ اگرچہ وہ محبوب پر دل و جان سے فدا ہوتے ہیں، لیکن پاس ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ اہل زمانہ اور بعض اوقات محبوب کو بھی اپنے عشق سے آگاہ نہیں کرتے۔ چناں چہ عشق کی ہلکی سی چنگاری جو عاشق کے دل میں حسن محبوب کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی، اندر ہی اندر جل کر تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور ایک وقت وہ آتا ہے کہ یہ سلگتی ہوئی چنگاری آگ کے الاؤ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لیکن عاشق پھر بھی وضع داری اور راز کو مخفی رکھنے پر ہی کمربستہ رہتا ہے۔ کیوں کہ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب کا لحاظ ہوتا ہے۔ چناں چہ میر تقی میر کہتے ہیں:

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے | عشق بن یہ ادب نہیں آتا

ایک اور شاعر کے الفاظ میں۔

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا | شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

تاہم میرزا خان داغ نے عاشقوں کی روایتی پاس داری سے بالکل جدا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک عشق کی مخفی آگ لاحاصل اور بے فائدہ ہے۔ اول تو محبوب پر وفا شعاری نہیں کھلتی اور اسے عاشق و رقیب کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مزید برآں اس یک طرفہ محبت سے جس سے محبوب آشنا ہی نہ ہو وصل و دیدار کی امید رکھنا فضول ہے۔ چناں چہ شاعر نے ان تمام نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے محبوب کے سامنے اپنے عشق کا اظہار کر دیا۔ بقول شاعر:

عیاں تجھ پر حقیقت کر رہا ہوں | کہ میں تجھ سے محبت کر رہا ہوں

لیکن اس بات کا اظہار کرنا تھا کہ شاعر پر غم و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ زمانے نے طعن و تشنیع شروع کر دی۔ عاشق کو برا بھلا کہا۔ ہر جگہ محبوب کی تشہیر ہوئی۔ اپنی رسوائی کا سن کر محبوب بھی خفا ہو گیا اور اس نے بھی شاعر کو بے ادب اور منہ پھٹ کہا۔ تاہم شاعر کہتا ہے کہ ٹھیک ہے عشق کے راز عیاں ہونے سے مصائب کا طوفان برپا ہو گیا ہے لیکن محبوب کو اتنا تو ضرور یقین ہو گیا ہو گا کہ میں ہی اس کا سچا عاشق ہوں اور اس کی خاطر اتنے دکھ جھیل سکتا ہوں۔ محبوب پر یہ حقیقت ضرور واضح ہو گئی ہے کہ میں وفا شعار عاشق ہوں اگر چہ وقتی طور پر میرے اس فعل سے محبوب برانگیختہ ہوا ہے۔

کچھ جرم نہیں عشق جو دنیا سے چھپائیں | ہم نے تمھیں چاہا ہے ہزاروں سے کہیں گے

شعر 5

گو نامہ بر سے خوش نہ ہوا پر ہزار شکر   مجھ کو وہ میرے نام سے پہچان تو گیا

(بہاول پور 2007، ملتان 2009، ڈی جی خاں 2006، سرگودھا 2010)

حل لغت: نامہ بر: قاصد

مفہوم: اگرچہ محبوب قاصد سے خوش نہ ہوا لیکن یہ بھی بہت قابل شکر بات ہے کہ محبوب مجھے میرے نام سے پہچان تو گیا۔

تشریح:

زمانہ قدیم میں ڈاک کا نظام زیادہ بہتر نہ تھا۔ تاہم عام معاملات کے لیے ڈاک گھوڑے وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ لیکن ڈاک کا نظام کسی عاشق کے لیے قطعاً سودمند نہ تھا اور یہ نظام زیادہ ترقی یافتہ بھی نہیں تھا، اس لیے بعض اوقات بددیانتی کے واقعات پیش آتے یعنی قاصد یا ڈاکیا از خود خطوط کا مطالعہ شروع کر دیتا۔ یہ صورت حال عشاق کے لیے بہتر نہ تھی اور اس طرح بھید کے افشا ہونے کا خطرہ ہوتا۔ چناں چہ اکثر اوقات عاشق کسی تیسرے شخص یا قاصد کو محبوب کی طرف پیغام پہنچانے کے لیے استعمال کرتا، تا کہ اس کا راز، راز ہی رہے۔ بعض اوقات زبانی پیغام بھی بھیجا جاتا جس کے لیے قاصد وغیرہ قطعی ناموزوں ہوتا تھا۔

تشریح طلب شعر میں بھی شاعر نے ایک قاصد کو پیغام رسانی کے لیے منتخب کیا تا کہ محبوب اس کے جذبات، خیالات اور جذبہ عشق سے آگاہ ہو سکے۔ دراصل بہت مدت تک ایک عاشق محبت کے جنون کو اپنے دل میں چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کب تک؟ آخر ایک روز خود ہی وہ نامہ بر کو بھیجنے کا فیصلہ کرتا ہے یہی کیفیت شاعر کی ہے اب اسے دلی جذبات کو مخفی رکھنا ناگزیر نظر آ رہا ہے چناں نچہ وہ پیام بر کے ہاتھوں مراسلہ ارسال کرتا ہے۔ بقول شاعر:

ع   پیار کا میں اظہار نہ کرتا تو مر جاتا   سچ کو کیسے دل میں چھپایا جا سکتا ہے

اکثر اوقات محبوب کا یہ طرز عمل رہا ہے کہ وہ خط کو پڑھے بغیر ہی بے نیازی سے پھاڑ دیتا ہے یا طیش میں آ کر نذر آتش کر دیتا ہے۔ اسی طرح کی کیفیت کا اظہار مرزا غالب یوں کرتے ہیں:

ع   کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب!   قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کو جلانے کی

لیکن شاعر کے ساتھ معاملہ برعکس ہوا ہے۔ اس کے محبوب نے اگرچہ قاصد کو برا بھلا کہا، لیکن عاشق کے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ محبوب نے روایتی طرز عمل اختیار نہ کیا، نہ خط کو پھاڑا اور نہ جلایا بلکہ عاشق کا نام دیکھ کر برہم ہوا۔ شاعر اس بات پر بہت خوش ہے کہ محبوب کے نرم پڑنے کا یہ پہلا زینہ ہے اور وہ شکر گزار ہے کہ محبوب نے اسے اس کے نام سے پہچان لیا ہے اور اب یہ بات اس کے احاطۂ علم میں آ چکی ہے کہ میں ہی اس کا عاشق ہوں۔

ع   یہ غنیمت ہے کہ اُن آنکھوں نے پہچانا ہمیں   کوئی تو سمجھا دیارِ غیر میں اپنا ہمیں

شعر 6

بزمِ عدو میں صورت پروانہ دل مرا   گو رشک سے جلا، تیرے قربان تو گیا

حل لغت: بزم عدو: رقیبوں کی محفل   صورت پروانہ: پتنگے کی مانند

مفہوم: محبوب کو رقیبوں کی محفل میں دیکھ کر میرا دل جل گیا۔ لیکن اے محبوب اگرچہ یہ دل رشک سے جلا لیکن پھر بھی قربان تو تجھ پر ہی ہوا ہے۔

تشریح:

زیرِ تشریح شعر میں شاعر نے محبوب کی بے رخی، بے نیازی، بے التفاتی، لاپروائی اور بے وفائی کا مضمون باندھا ہے۔
شاعر کہتا ہے کہ وہ محبوب کو اپنے جذبات و احساسات سے آگاہ کرنے کے لیے گھر سے نکلا۔ آج یہ فیصلہ کیا تھا کہ محبوب کو اپنے حالات بتاؤں۔ تاکہ کچھ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ جب وہ محبوب کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر دل تھام کر رہ گیا کہ محبوب رقیبوں کی محفل سجائے بیٹھا ہے اور رقیب محبوب سے اظہارِ محبت اور وفاداری کے بلند بانگ دعوے کر رہے ہیں۔ محبوب مانندِ شمع ان تمام لوگوں کا مرکز و محور تھا۔ لیکن اس تمام قصے کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ محبوب بھی رقیبوں پر لطف و عنایات کی بارش کر رہا تھا۔ وہ بھی پیار کا جواب پیار سے دے رہا تھا۔ انھیں اپنے دیدار سے سرفراز کر رہا تھا اور ان سے محوِ گفتگو تھا۔ جب کہ محبوب مجھ سے برعکس رویہ اپنائے ہوئے تھا۔ میرے ساتھ وفاؤں کے بدلے میں بے رخی اور غیروں سے وفا کے بدلے میں قربت، عاشق ان باتوں کو دیکھ کر کب برداشت کر سکتا تھا۔ یہ منظر تو اس پر بجلی بن کر گرتا ہے اور اس کے قلب و ذہن کی دنیا میں ایک بھونچال آ جاتا ہے۔ بقول شاعر:

جو میرے عدو تھے، رقیب تھے، وہ ترے قریب قریب تھے　　مجھے تُو نے اذنِ وصال بھی، کبھی ایک پل کو دیا نہیں

عاشق کو تو محبوب کے ساتھ رقیبوں کا میل جول بالکل ناپسند ہوتا ہے۔ یہی حالت تشریح طلب شعر میں شاعر بیان کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ منظر دیکھ کر رشک طاری ہو گیا۔ کہ رقیب بھی کس قدر خوش نصیب ہے کہ محبوب اس سے ناز و ادا کے ساتھ ہم کلام ہے۔ اور یہ منظر دیکھ کر میرا دل کسی پتنگے کی مانند محبوب پر قربان ہو گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ میرا دل رشک سے قربان ہوا ہے لیکن دل قربان کرنے کا موقع تو ملا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ رشک سے ہوا ہے یا حسد سے۔ بقول انشاءاللہ خاں

عجیب رسم دیکھی ہے بروزِ عیدِ قرباں　　وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا

شعر 7　　ہوش و حواس و تاب و تواں، داغ! جا چکے　　اب ہم بھی جانے والے ہیں، ساماں تو گیا

حل لغت:　　ہوش و حواس: عقل و سمجھ، فہم و فراست　　تاب و تواں: طاقت و توانائی

مفہوم:　　اے داغ! ہماری عقل و فراست، طاقت و توانائی رخصت ہو گئی ہے اور اب ہم بھی جانے والے ہیں کیوں کہ ہمارا سامان جا چکا ہے۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر نے ناتوانی کا مضمون باندھا ہے۔ جوانی میں انسان کے اعضا مضبوط، اعصاب طاقت ور دماغ پر جوش اور طاقت عروج پر ہوتی ہے۔ جیسے جیسے انسان بوڑھا ہوتا ہے ویسے ویسے اس کی جوانی کی صلاحیتیں ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اعضا کمزور، اعصاب ناتواں، ذہن میں فہم و فراست کم، دماغ بے جوش اور طاقت روبہ زوال ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑھاپے کی علامات ہوتی ہیں جو اس بات کی عکاس ہوتی ہیں کہ انسان اب موت کے قریب سے قریب تر ہو رہا ہے۔ اس لیے غالب نے کہا تھا:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ　　وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

شاعر نے بھی اسی کیفیت کے متعلق شعر گوئی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اب ہمارے فہم و فراست اور عقل و دانش بہت کم ہو چکی ہیں گویا یہ رخصت ہو چکی ہیں اور طاقت و توانائی کی بھی عدم موجوگی ہے۔ یعنی ہمارے بدن کی تمام صلاحیتیں جا چکی ہیں۔ جو اس بات کی غماز ہیں کہ اب ہم بھی جانے کے قریب ہیں۔ ہمارا مال و متاع اور سامانِ زیست جا چکا ہے اور ہم بھی اس دارِ فانی سے کوچ کرنے والے ہیں۔

مشق

سوال (1) مرزا داغ کی غزلوں کو ذہن میں لائیں اور درج ذیل مصرعے درست لفظ/الفاظ سے مکمل کریں۔

(ا) پھرے راہ سے ________ آتے آتے۔

(الف) درمیاں ✓ (ب) وہ یہاں (ج) ہم عناں

(۲) اب ہم بھی جانے والے ہیں ________ تو گیا۔

(الف) میزباں (ب) مہماں ✓ (ج) سامان

(۳) سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو ________ تو گیا۔

(الف) انسان (ب) سلطاں ✓ (ج) مہماں

سوال (2) ''اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا'' میں سامان کا مفہوم زیادہ سے زیادہ تین سطروں میں لکھیں

جواب بڑھاپے میں انسان کی اعصابی طاقت، توانائی، فراست، عقل و دانش وغیرہ کم ہو جاتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہماری یہ تمام صلاحیتیں جا چکی ہیں۔ شاعر نے ان صلاحیتوں ہی کو سامان کہا ہے۔

(3) اشعار کی تشریح کیجیے دیکھیے اشعار کی تشریح

(4) مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔

الفاظ		معنی
دل بے آرزو	:	ایسا دل جس میں خواہشیں پیدا ہونا بند ہو چکی ہوں
سنسان گھر	:	ویراں گھر
افشائے راز	:	بھید کا ظاہر ہونا
نامہ بر	:	خط یا پیغام لے کر جانے والا
اجل	:	موت

(5) دونوں غزلوں کے قوافی بالترتیب لکھیں۔

یہاں، کہاں، مہرباں، درمیاں، آندھیاں، زباں، ماں، ایماں، احسان، مہمان، جان و پہچان، قربان، سامان

(6) نصابی غزلوں کے علاوہ داغ کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری میں لکھیں:

غزل

دل مکدر مدام کا نکلا
کب یہ آئینہ کام کا نکلا

گھر سے تم کیوں نکالے دیتے ہو
کیا قصور اس غلام کا نکلا

یہ سنا ہے کہ اب وہ ہرجائی
صبح آتا ہے شام کا نکلا

وصل کی ان سے ہو گئی امید
سلسلہ جب کلام کا نکلا

سچ تو یہ ہے کہ عاشقی میں داغ
ایک ہی اپنے کام کا نکلا